پروفیسر ڈاکٹر مولانا شمسِ تبریز خاں قاسمیؒ

۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء - ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء

از: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر ''الداعی'' عربی واستاذ ادبِ عربی
دارالعلوم دیوبند

ممتاز معاصر فاضلِ دارالعلوم دیوبند، شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر اور سابق رفیق مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا پروفیسر ڈاکٹر شمسِ تبریز خاں قاسمی آروی ثم لکھنوی کے بہ وقتِ ظہر شنبہ: ۶ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۹ جنوری ۲۰۱۳ء، ہارٹ اٹیک کے بعد اچانک وفات پاجانے کی خبر راقم کو اخبار کے ذریعے، اُس وقت ملی، جب وہ اپنے علاج کے سلسلے میں ممبئی (سابق بمبئی) میں قیام پذیر تھا۔ خبر پر جیسے ہی نظر پڑی سخت صدمہ ہوا۔ دنیا میں کس کو ہمیشہ رہنا ہے؟ لیکن جب کوئی کام کا آدمی اِس طرح اچانک روپوش ہوجاتا ہے، تو علم وہنر کے قدردانوں کو جاں گسل رنج والم ہوتا ہے۔ مرحوم بہ وقتِ وفات سنۂ ہجری کے اعتبار سے ۷۰ سال اور سنۂ عیسوی کے لحاظ سے ۶۸ برس کے تھے۔

مرحوم کی نمازِ جنازہ شنبہ - یک شنبہ: ۶ - ۷ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ = ۱۹-۲۰ جنوری ۲۰۱۳ء کی درمیانی شب میں، اُن کے مکان واقع ''مدح گنج'' کے قریب میدان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عالی قدر مہتمم حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ نے پڑھائی اور محلّہ ''کھدرا'' کے قبرستان ''تکیہ تارن شاہ'' میں اُنھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ نمازِ جنازہ اور تدفین میں بڑی تعداد میں عُلما وطلبہ اور مرحوم کے محبین ومتعارفین واعزا وقدردانوں اور عام مسلمانوں نے شرکت کی۔ دوسرے روز اُن کی وفات کی خبر جیسے ہی مدرسوں اور علم وادب سے وابستہ حلقوں میں پہنچی غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ معاصر مشاہیر نے اخبار ورسائل میں اپنے شدید غم والم کا اِظہار کیا۔

مرحوم نے اپنے پیچھے اپنی اہلیہ کے علاوہ چار لڑکے اور چار لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ اُنھوں نے

لکھنؤ میں بود و باس اختیار کر رکھی تھی، اُن کی ساری اولادیں اور اہل خانہ اُنھی کے ساتھ لکھنؤ میں رہتے تھے، جہاں اُنھوں نے ''مدح گنج'' میں سال ہا سال کے چنے ہوئے ''تنکوں'' سے اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی پوری عملی زندگی یہیں بتائی۔ کم وبیش پچاس سال کا عرصہ اُنھوں نے علم وادب وظرافت وسلیقہ مندی وبذلہ سنجی کے اِسی شہرِ سخن فہم وسخن سنج میں گزارا اور بالآخر اِسی کی خاک کا پیوند بنے۔

مولانا شمسِ تبریز ممتاز عالم، محقق اور اردو زبان کے ادیب واہلِ قلم تھے، ساتھ ہی عربی وفارسی کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے، نیز انگریزی اور ہندی بھی ضرورت کے مطابق جانتے تھے۔ اِسلامی اور عام اِنسانی تاریخ کا اُن کا مطالعہ خاصا ٹھوس اور لائقِ اعتماد تھا۔ عربی زبان کی مہارت کے حوالے سے اُنھیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

مولانا شمسِ تبریز خاںؒ دارالعلوم دیوبند میں اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں بھی محنت، ذوقِ طلب، شوقِ سفر، مطالعے میں اِنہماک، وقت کی قدردانی، نماز روزے، عبادات وشرعی اَحکام کے ساتھ دارالعلوم کے نظام وقانون کی پابندی اور ادبی ولسانی رجحان کے حوالے سے، طلبہ میں مشہور اور بڑے نیک نام تھے۔ یہ راقم دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو حال آں کہ وہ یہاں سے کئی سال پہلے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد جاچکے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس تحقیقات سے وابستہ ہوچکے تھے؛ لیکن اُن کی تعلیمی محنت وشب بیداری کے حاصل یعنی لائقِ ذکر صلاحیت کی یادوں کی شمع نہ صرف طلبہ کے دلوں میں روشن تھی؛ بل کہ اُس کا خوب صورت اور والہانہ تذکرہ اُن کی زبانوں پر نغمۂ شیریں بن کر گونج رہا تھا۔

اِن سطروں کی تحریر کے وقت راقم کے ذہن میں آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی بنارسی مدظلہ العالی سے، جو مرحوم کے تدریسی دور میں دارالعلوم دیوبند میں ہم عصر تھے؛ کیوں نہ اُن کے سلسلے میں یہ معلوم کیا جائے کہ وہ دارالعلوم میں کس طرح کے طالب علم تھے؟۔ راقم نے دفترِ اہتمام میں سہ شنبہ: یکم ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ=۱۲؍فروری ۲۰۱۳ء کو تقریباً دس بجے صبح کو اُن سے ملاقات کی اور گزارش کی کہ وہ مولانا شمسِ تبریز خاں کے متعلق کچھ جانتے ہوں تو راقم کو بتائیں۔ اُنھوں نے بے تکلف جلدی جلدی میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''مولانا شمسِ تبریز خاں قاسمی مرحوم- اللہ اُن کے درجات بلند کرے- طالبِ علمی کے

زمانے میں ''شمس تبریز آروی'' کے نام سے معروف تھے؛ کیوں کہ وہ ''بہار'' کے ضلع ''آرہ'' کے تھے۔ وہ کم گو، خاموش طبع، کم آمیز، پابندِ اوقات، پابندِ نماز باجماعت تھے، پڑھائی لکھائی میں انہماک اُن کی شناخت تھی۔ اردو زبان وادب اور فارسی سے اُنھیں بڑی مناسبت تھی۔ وہ ادیبِ کبیر ومفسرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء - ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء) سے مسلسل مراسلت میں رہتے تھے۔ میں ''اِحاطۂ مولسری'' سے تقسیمِ ڈاک کے اوقات میں جب بھی گزرتا ''پیارے'' ڈاکیہ کو پاتا کہ وہ اُن کی ڈاک علاحدہ رکھے ہوتا، جس میں اکثر ''صدقِ جدید'' کا تازہ شمارہ ہوتا؛ کیوں کہ وہ ہفت روزہ تھا اور مولانا دریا آبادی کا کوئی نہ کوئی جوابی خط بھی اکثر رہتا تھا، جس پر کبھی کبھی صرف یہ لکھا ہوتا: ''آپ کا تازہ خط بھی مل گیا، بہت بہت شکریہ'' وہ نمازوں کے اوقات میں بالخصوص ظہر کے وقت اذان کے فوراً بعد مسجدِ قدیم (جو اِحاطۂ دفتر میں صدر گیٹ کے دائیں جانب واقع ہے) میں آجاتے، مُکبِّر کی دائیں جانب جگہ لیتے اور سنت کی چار رکعتیں پڑھ کے عموماً ''صدقِ جدید'' کو اُس وقت تک بہ غور پڑھتے رہتے؛ جب تک جماعت کھڑی نہ ہوجاتی۔

اُس زمانے میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ صوبۂ یوپی اور صوبۂ بہار کے طلبہ میں ادبی اور لسانی مقابلہ آرائی اِتنی زور کی ہوگئی کہ وہ ''ادبی تصادم'' اور ''ادبی جھگڑے'' کی حد کو پار کر کے ''عملی جھگڑے'' کے قریب پہنچ گئی۔ اُس زمانے میں ''بہار'' کے تین طلبہ تحریر وانشا کے حوالے سے طلبۂ دارالعلوم میں خاصے مقبول اور معروف تھے: ایک تو یہی ''شمسِ تبریز آروی''، دوسرے شعیب جالویؒ (جو بعد میں رانچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر رہے اور رانچی ہی کی خاک میں آسودۂ خواب ہوگئے اور جو مولانا قاضی مجاہد الاِسلام قاسمیؒ [۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء - ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء] کے بھانجے ہوتے تھے) اور تیسرے ''اسرارالحق عسجد القاسمی'' (سابق ناظم جمعیۃ علماے ہند جو اِس وقت مولانا اسرارالحق قاسمی ایم پی اور تعلیمی وملی فاؤنڈیشن کے بانی وصدر ہیں۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی میں ہر ہفتے سال ہا سال سے پابندی سے ملک وملت ومذہب کے مختلف موضوعوں پر اُن کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں)

اِن تینوں طلبہ کی وجہ سے سچی بات یہ ہے کہ اِس ''ادبی ولسانی تصادم'' میں ''بہار'' کے طلبہ کا پلڑا بھاری ہورہا تھا۔ ایک بار ''شمسِ تبریز خاں آروی'' مرحوم نے ''بہارِ بہار'' کے نام سے ایک رسالہ فارسی نظم میں نکالا یہ پورا رسالہ صرف نظم ہی پر مشتمل تھا، جس میں بہار اور بہار کے اہلِ کمال

کی عظمت بڑے فخریہ انداز میں بیان کی گئی تھی، اِس سے ''تصادم'' کی کیفیت میں بہت شدّت آ گئی۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء -۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء) نے یوپی اور بہار کے طلبہ کے یہ سارے دیواری رسالے ضبط کر لیے اور اُنھیں دفترِ اہتمام میں جمع کر دیا، جن میں بہار کے مذکور الصدر تینوں طلبہ کی ادبی تحریریں، بالخصوص ''شمس تبریز خاں آروی'' کی نگارشات اور بالاَخص اُن کی فارسی نظم پر مشتمل ''بہارِ بہار'' کا خاص شمارہ بھی تھا، اُن تحریروں پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء - ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کی اُچٹتی نظر دفترِ اہتمام میں پڑی، تو آپ نے فرمایا کہ ''منفی ہدف سے قطع نظر، جس کے تحت طلبہ نے یہ تحریریں لکھیں، یہ اپنی جگہ زبان و بیان کے اِعتبار سے خاصی ممتاز ہیں اور اِن طلبہ کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہیں''۔ (یہاں حضرت مہتمم صاحب: مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ کی گفتگو پر مبنی اِفادات ختم ہوے)

مولانا شمسِ تبریز خاں قاسمیؒ نرم خوئی و دھیمے پن کا مجسمہ تھے، خاموشی اور کم گوئی اُن کی شناخت تھی، وہ اِنتہائی ضرورت کے وقت اور ضرورت کے بہ قدر ہی بولتے تھے، صاف دل اور پاک نفس اِنسان تھے، زور سے ہنستے نہ قہقہہ لگاتے، وہ بہ مشکل صرف مسکراتے، کسی کی بے آبروئی، تنقید و تضحیک سے اُن کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے، عموماً وہ کسی سے کوئی واسطہ رکھتے نہ لوگوں کو اُن سے کوئی واسطہ ہوتا، حد درجہ صابر و شاکر اور متحمل مزاج تھے، جب بھی بات کرتے تو علم و مطالعے کی کرتے اور خاصی ہلکی آواز سے بولتے، اُن کے رہن سہن، لباس و پوشاک اور عام زندگی کے سارے اطوار میں حد درجہ سادگی تھی، کسی کے لیے اُن کی انتہائی سادہ اور معمولی ہیئتِ کذائی سے اُن کے ممتاز فاضل، عالم، وسیع المطالعہ اور ادیب و اہلِ قلم ہونے کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا، وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے؛ لیکن تیز چلتے، چلتے ہوے اُن کی نگاہیں زمین پر مرکوز رہتیں، وہ متوسط القامت؛ بل کہ مائل بہ کوتاہ قامتی تھے، بھنویں گھنیریں اور خوب صورت تھیں، کھلا ہوا گندم گوں رنگ، آنکھوں میں شرافت اور شرمیلا پن، جسم متوسط نہ دبلا نہ موٹا، اردو تحریر صاف ستھری، واضح اور بغیر لکیر کے کاغذ پر سیدھی ہوتی، تحریر میں لکھتے وقت کاٹ چھانٹ نہ کرتے۔ راقم نے کئی بار اُن سے پوچھا کہ آپ کس طرح لکھتے ہیں کہ تحریر میں کاٹ چھانٹ نہیں ہوتی، تو وہ کہتے کہ میں الفاظ اور جملوں کو سوچتے وقت ذہن ہی میں بار بار کاٹتا رہتا ہوں، کاغذ پر اُسی وقت لکھتا ہوں جب وہ صحیح اور پختہ شکل میں میرے ذہن میں مُدوَّن ہو جاتے

ہیں؛ البتہ اُن کی ایک عجیب سی عادت تھی کہ وہ لکھتے وقت بار بار قلم کو جھٹکتے تھے؛ کیوں کہ وہ بہت معمولی قلم کی طرح روشنائی بھی بہت معمولی سی استعمال کرتے تھے، جس سے قلم کی نوک بار بار خشک ہوجاتی تھی، اُس کو تر کرنے کے لیے وہ بار بار قلم کو زور سے جھٹکتے تھے؛ تاکہ قلم کی نوک بھیگ جائے اور تحریر میں پریشانی نہ ہو۔ کثرت سے ایسا کرنے کی وجہ سے یہ اُن کی ایسی عادت بن گئی تھی کہ شاید اس کے بغیر وہ تحریر لکھنے پر قادر نہ تھے۔

وہ دارالعلوم دیوبند کے اپنے معاصر فضلا میں اردو زبان وادب پر عبور کے حوالے سے خاصے ممتاز تھے۔ اردو میں ان کا اُسلوبِ نگارش علامہ شبلی نعمانی (۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء -۱۳۳۲ھ /۱۹۱۴ء) کے باوقار اسلوب اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء -۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۸ء) کے شان دار اسلوب کا مخلوطہ تھا، وہ مُستحکم، صحیح، خوب صورت، حشو وزوائد سے پاک، ادبی مٹھاس سے لبریز اور زبان وبیان کے معیار پر ہر طرح صحیح اُترنے والی اردو نثر لکھتے تھے۔ اِسی کے ساتھ وہ عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے فن کار اور ماہر مترجم تھے۔ عموماً اچھے اہلِ قلم اچھے مترجم اور اچھے مترجم لائقِ ذکر اہلِ قلم نہیں ہوتے، بالخصوص ادبی وفکری زبان کا اُسی طرح کی ادبی وفکری زبان میں ترجمہ اور بھی مشکل کام ہے، جو بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے۔ ترجمے میں دو باتیں ضروری ہیں: امانت دارانہ ترجمہ کیا جائے کہ ''مُتَرْجَمْ منه'' زبان (جس زبان کا ترجمہ کیا جائے) کی کوئی بات ''مُتَرْجَمْ اِلیه'' زبان میں (جس زبان میں ترجمہ کیا جائے) منتقل ہونے سے رہ نہ جائے۔ دوسری بات یہ کہ مُتَرْجِم (ترجمہ کنندہ) کو دونوں زبانوں پر بھرپور قدرت ہو؛ تاکہ ایک زبان کی ساری نہ سہی تو اکثر خوبیوں اور نزاکتوں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے میں اُسے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ مولانا شمس تبریز قاسمیؒ نے دونوں لیاقتوں میں اپنا لوہا منوایا اور برِّصغیر کے بڑے بڑے اُدبا ومُسلّم اہلِ قلم نے اُن کی دونوں صلاحیتوں کی ہمیشہ داد دی۔ اُنھوں نے اردو میں باقاعدہ تالیف وتصنیف کے علاوہ عربی سے اُردو میں کئی اہم علمی اور ادبی وفکری کتابوں کے ترجمے کیے، جو معیاری اردو میں ترجمے کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ یہ ترجمے جب وقت کے مشاہیر علم وادب کی نظر سے گزرے، تو اُنھوں نے اپنے قلمی تبصروں میں نہ صرف اُنھیں سراہا؛ بل کہ یہ تک فرمایا کہ اِن ترجموں سے کہیں سے ترجمے کی بو یا ''ترجمہ پن'' محسوس نہیں ہوتا؛ بل کہ یہ ترجمے اردو میں مستقل تخلیقات ہی معلوم ہوتے ہیں؛ چناں چہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء -۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) کی کتاب ''رَوَائِعُ إقْبَال''

کا اُنھوں نے جب ''نقوشِ اِقبال'' کے نام سے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اِشاعت پذیر ہوکر اہلِ علم وقلم ونظر کے پاس پہنچا، تو اُنھوں نے جہاں اصل عربی میں تحریر کردہ حضرت مولانا ندوی مرحوم کے افکار وخیالات اور عربی مُعلّٰی کی کماحقُّہٗ تعریف کی، وہیں ترجمے کی شیریں وشستہ وبرجستہ اردو کی خوبی کو بھی قارئین کے لیے بڑی فراخ دلی سے اجاگر کیا؛ حال آں کہ حضرت مولانا ندویؒ کی یہ کتاب اُن کی تالیفات میں اپنی ادبیّت، تعبیر وتصویر کی خوبی، فکری گہرائی، خیالات کے بانکپن کی وجہ سے خاصی مشکل ہے؛ کیوں کہ اِس میں شاعرِ اسلام علامہ ڈاکٹر ''محمد اِقبال'' (۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء - ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) کے عالی قدر افکار وخیالات اور اسلام کی ترجمانی، مسلمانوں کی عظمت بیانی، کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی مُعجز نمائی اور اسلامی تہذیب وثقافت کی فضیلت مآبی کے بالمقابل مغربی تہذیب کے تخریبی کردار کے بیان میں، اُن کے جادوطراز اشعار اور ہمالیائی لب ولہجے کا، حضرت مولانا ندویؒ نے اُسی طرح کی جذبات انگیز، ایمان افروز اور قلب وروح کی بھٹی کو گرما دینے والی اَعلیٰ اور اَلبیلی عربی میں تعارف پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اُن کی عربی نثر کا بہترین نمونہ اور خود اُن کی غیرتِ اسلامی، حمیتِ دینی اور جذبۂ مومنانہ کی بھی ترجمان ہے۔ اُنھوں نے اِقبال کے آئینے میں قارئین کے سامنے اپنے سوز وساز کو بھی پیش کیا ہے۔ غالباً اِس کتاب کا یہ پہلو بھی بہت اہم اور لائق کشش ہے؛ کیوں کہ اقبالؒ کو وہ چاہتے ہی اِس لیے تھے کہ اِقبال نے اُن کے دل کی بات کہہ دی تھی اور اُن کے زخمِ دل کے لیے شفا بخش مرہم فراہم کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اقبال کو اپنا ہم راز، ہم سخن اور ہم نوا سمجھتے تھے، دونوں کا درد ایک تھا؛ دونوں کے زخمِ جگر میں مماثلت تھی، دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے، دونوں قافلۂ حجاز میں کسی ''حُسَیْن'' کو پالینے کا حسین خواب دیکھتے تھے، دونوں اِسلام کے اِقبال اور اُس کی نشأتِ ثانیہ کے سچے آرزومند اور داعی ونقیب تھے۔ دونوں کے سوز وسازِ رومی اور پیچ وتابِ رازی اور آہ وزاری وشب زندہ داری، کی اصل وجہ بھٹکے ہوے آہو کو پھر سوے حرم لے آنے کی تگ وتاز میں اپنی زندگیِ مستعار میں خاطر خواہ کام یابی سے عدمِ ہم کناری کا شدید تر اِحساس تھا؛ اِس لیے دونوں ایک دوسرے کو زبانِ حال سے کہتے تھے:

آ عندلیب! مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلّاؤں ہائے دل

اِس طرح کی کتاب کو اردو ادب کے قالب میں ڈھال دینا مولانا شمس تبریز خاں قاسمیؒ کا بڑا

کارنامہ تھا، اِسی لیے اردو کے دقیق النظر ادیب وصحافی و اِنشا پرداز ومفسرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادیؒ نے ''صدق جدید'' میں جہاں حضرت مولانا علی میاںؒ کی زبان کی عظمت ورفعت کی تقریظ کی، وہیں مولانا شمسِ تبریز کی ادبی ہنرمندی کا بھی گن گایا، جو بہت بڑی بات تھی؛ کیوں کہ مولانا دریا آبادی بہ مشکل کسی تازہ وارِدِ بساطِ ادب وزبان کی زبان وبیان کے حوالے سے مدح سرائی کرتے تھے۔

مولانا شمسِ تبریز قاسمیؒ کی مطلوبہ علمی وتحریری لیاقت ہی کی وجہ سے حضرت مولانا ندویؒ نے اپنی مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء کے علمی وتحریری رفیق کی حیثیت سے اُن کا انتخاب کیا، جس میں اُنھوں نے ۳؍اگست ۱۹۶۶ء (مطابق ۶؍جمادی الاخری ۱۳۸۸ھ) سے اپنی ذمّے داریاں انجام دینی شروع کیں۔ اُنھوں نے وہاں سب سے پہلے اپنی اولین اردو تالیف ''مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام'' تیار کی؛ پھر ''تاریخ ندوۃ العلماء'' کی دوسری جلد لکھی، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء - ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) کی مشہور کتاب "اِقْتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ" کا اردو میں ''اِسلامی وغیر اِسلامی تہذیب'' کے عنوان سے ترجمہ کیا، حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی کتاب ''رَوَائِعُ إِقْبَال'' کا ''نقوشِ اقبال'' کے نام سے اردو میں شان دار وشاہ کار ترجمہ کیا اور مشہور عالم وادیب واہلِ قلم نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء - ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء) کی سیرت وسوانح بہ عنوان ''صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی'' تحریر کی، اسی کے ساتھ حضرت مولانا علی میاںؒ کی تالیف وتحریر میں اُن کی علمی وتحریری معاونت کی، اُن کی ہدایت کے مطابق وہ تاریخ وسیرت وسوانح کی ادق اردو وفارسی اور عربی کتابوں سے مطلوبہ زیرتالیف کتابوں اور مقالات کے لیے مواد اکٹھا کرتے یا صحیح مصادر ومراجع کی نشان دہی کرتے۔ انھوں نے حضرت مولانا کی اِملائی خدمت بھی کی۔ وہ جو کام بھی کرتے، خلوص ومحنت اور لگن اور لیاقت سے کرتے؛ اِس لیے حضرت مولاناؒ اُنھیں دل سے درازیِ عمر، رزق اور صحت ووقت میں برکت کی ہمیشہ دعا دیتے تھے۔

اِسی کے ساتھ اُنھوں نے بہت سے مقالات ومضامین مختلف علمی وادبی ولسانی واسلامی موضوعات پر، برّصغیر کے بہت سے باوقار رسالوں میں لکھے، جو شوق وذوق سے پڑھے گئے۔ البتہ افسوس ہوتا ہے کہ اُن کے ادبی وعلمی مقام ومرتبے کے بہ قدر اُن کو علمی وادبی معاشرے میں وہ عزت وشہرت نہ مل سکی، جس کے وہ مستحق تھے، وہ مادی اسباب اور مال ومنال سے بھی تہی مایہ ہی

رہے؛ کیوں کہ ہمارے معاشرے میں کسی کی ازخود قدر نہیں ہوتی؛ بل کہ خواہش منداور ’’ہوشیار آدمی‘‘ اپنی قدر خود کروالیتا ہے۔ اپنی ذات وصفات کا ڈھول پیٹنے والے اور اپنی شخصیت کی عظمت پر لوگوں کو ایمان لے آنے پر مجبور کردینے والے اِنسانی سوسائٹی میں بڑا نام پالیتے ہیں اور اُن کی ساری ضرورتیں ازخود پوری کردی جاتی ہیں؛ لیکن خاموشی سے صرف کام میں لگے رہنے والے کو کوئی گھاس نہیں ڈالتا، خواہ وہ فی الواقع کتنا بڑا کیوں نہ ہو اور اُس نے خونِ جگر جلا کے اُمت اور ملت کے لیے کتنا مفید اور دیرپا کام کیوں نہ کیا ہو۔ مولانا شمس تبریز قاسمی اور اُن جیسے اہلِ کمال- جنھیں خونِ دل لٹانے کے بعد بھی معاشرے میں سرخ روئی نہیں مل پاتی - کی زبانِ حال سے یہ صدا ہمیشہ سننے کو ملتی رہے گی:

هَنِيئًا لِأَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهُمْ
وَلِلْعَاشِقِ المِسْكِينِ مَا يَتَجَرَّعُ

اہلِ نعمت وثروت کو اُن کی نعمت وثروت مبارک ہو۔ بیچارے عاشق کے لیے تو تلخ کامی کا وہ گھونٹ ہی مقدر ہے جس کو وہ مسلسل پی رہا ہے۔

مرحوم نے ندوۃ العلماء کی ’’مجلس تحقیقات ونشریاتِ اِسلام‘‘ میں تقریباً ۱۹؍سال تک علمی وتحریری کام کیا یعنی ۳؍اگست ۱۹۶۸ء (۶؍جمادی الاُخری ۱۳۸۸ھ) سے ۱۴؍جنوری ۱۹۸۷ء (۱۷؍جمادی الاُخری ۱۴۰۷ھ) تک۔ اس کے بعد وہ ۱۵؍جنوری ۱۹۸۷ء (۱۸؍جمادی الاُخری ۱۴۰۷ھ) کو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے ریڈر پھر پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے؛ کیوں کہ اُنھوں نے اسی یونیورسٹی کے اسی شعبے سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی تھی؛ یہاں تاحیات کام کرتے رہے، وہ اپنی بے نفسی کی وجہ سے یہاں سارے تدریسی وغیر تدریسی عملہ وطلبہ میں بہت مقبول ومحبوب رہے؛ کیوں کہ وہ کبھی کسی کے لیے مضر رہے، نہ اپنی زبان اور ہاتھ سے کسی کو نقصان پہنچانے کی سوچا۔ ایسا آدمی جہاں رہتا ہے، لوگ اُس سے محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

جیسا کہ راقم کو یاد ہے، وہ اواخرِ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق اوائلِ فروری ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا، پہلے دو تین ماہ اُس کا قیام حضرت مولانا کے وطن ’’تکیہ کلاں‘‘ رائے بریلی میں رہا، پھر وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بہ حیثیت استاذ کام کرنے لگا، تکیہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا شمسِ تبریز سے متعارف ہوا اور تقریباً روزانہ ہی حضرت مولانا کی تصنیفی وتحریری مجلس میں اُن سے ملاقات ہوتی رہی، جو ناشتے کے بعد سے

ظہر سے ذرا پہلے کے دورانیے میں ہوا کرتی تھی، تقریباً دس سال مولانا شمسِ تبریز کو بہت قریب سے دیکھنے اور اُن کی شخصیت کی گہرائیوں میں اُترنے کا موقع ملا، راقم نے اُنھیں اُسی طرح کا پایا جس کی طرف اُس نے سطورِ بالا میں اِشارہ کیا ہے۔ اُن کے ساتھ بار بار بازار بھی جانے کا موقع ملا اور کئی بار ''حضرت گنج'' کے نسبتاً ''متمدن ومہذب'' بازار جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں اُن کے لکھنوی اُدبا وشعرا دوستوں کی متعدد چائے خانوں میں بے تکلف مجلسیں برپا ہوتی تھیں اور وہ موقع ملنے کی صورت میں، اُن میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ بارہا اُن کے ساتھ ''رائے بریلی'' آمد ورفت کی بھی صحبت ملی اور سفر کی راہ سے، جس میں آدمی صحیح طور پر جانا اور پرکھا جاتا ہے، اُنھیں سمجھنے کا موقع ملا۔ کہا جاسکتا ہے کہ راقم کو اُنھیں اِس طرح قریب دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا کہ بعض دفعہ فردِ خاندان کو بھی نہیں ملتا۔ راقم نے اُنھیں پایا کہ وہ بہت سادہ دل، سادہ مزاج آدمی تھے، وہ غالباً اپنے آپ کو بھی زیادہ نہیں جانتے تھے، نہ اُنھیں اپنا غم ستاتا تھا، نہ اپنے اہلِ خانہ کا، ایسا آدمی دوسروں کو کوئی ضرر پہنچانے کی ''صلاحیت'' سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ وہ بہت سارے اُن گناہوں سے محفوظ تھے جو فضول گوئی، کثرتِ کلام اور پُرگوئی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور حدیث شریف کے مطابق بہت سے لوگوں کے لیے جہنم رسید ہونے کا واحد سبب ہوں گے۔ آج سے کم وبیش ۳۳ سال قبل راقم نے اُنھیں اِسی حالت میں چھوڑا تھا، اُس کے بعد اُن سے کبھی ملاقات نہ ہوسکی؛ لیکن توقع ہے کہ اِسی حالت پر اُن کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ اللہ بال بال اُن کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس کا مکین بنائے، حضور ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کا پڑوس نصیب کرے اور تمام لغزشوں سے جن سے کوئی فردِ بشر مُبَرّا نہیں درگزر فرمائے اور پس ماندگان اور تمام محبین کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل سے نوازے! (آمین)

مختصر سوانحی خاکہ

- **نام:** شمسِ تبریز خاں بن فخر الدین احمد خاں
- **وطن اصلی** (جائے پیدائش) بھوج پور، ضلع آرہ، بہار۔
- **تاریخ پیدایش** (دارالعلوم دیوبند میں داخلے کے وقت کے اندراج کے مطابق):
  ۱۵؍شعبان ۱۳۶۴ھ (۱۷؍جون ۱۹۴۵ء)
- **تعلیم:** ابتدائی تعلیم ''مدرسہ حنفیہ فرقانیہ'' شہر ''گونڈا'' یوپی میں حاصل کی اور متوسط واعلیٰ تعلیم

دارالعلوم دیوبند میں جہاں وہ ۲۲؍شوال ۱۳۸۰ھ (۱۲؍مارچ ۱۹۶۰ء) کو داخل ہوے اور شعبان ۱۳۸۴ھ (نومبر ۱۹۶۴ء) میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کی۔

❁ **دورۂ حدیث شریف** کے سال کتابوں میں حاصل کردہ نمبرات کی تفصیل مع متعلقہ اساتذۂ گرامی (یاد رہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اُس وقت آخری نمبر ۵۰ پچاس ہوا کرتا تھا، دارالعلوم میں ۵۰ کی بہ جائے ۱۰۰ نمبر کا اِجرا تعلیمی سال ۱۴۳۱ھ-۱۴۳۲ھ کے ششماہی امتحان سے ہوا):

۱- بخاری شریف: ۴۷ = حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء - ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) ۲- ترمذی شریف: ۴۱ = حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء - ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) ۳- مسلم شریف: ۴۰ = حضرت مولانا بشیر احمد خاںؒ (متوفی شنبہ: ۸؍جمادی الاخری ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۴؍ستمبر ۱۹۶۶ء) ۴- ابوداود شریف: ۴۲ = حضرت مولانا سید فخر الحسنؒ (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۰۵ء - ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) ۵- طحاوی شریف: ۴۳ = حضرت مولانا سید فخر الحسنؒ ۶- ابن ماجہ شریف: ۳۵ = حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء - ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) ۷- نسائی شریف: ۳۵ = حضرت مولانا شریف الحسنؒ دیوبندی (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء - ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) ۸- شمائل ترمذی: ۴۳ = حضرت مولانا سید فخر الحسنؒ ۹- موطأ مالک: ۴۵ = حضرت مولانا بشیر احمد خاںؒ ۱۰- موطأ محمد: ۳۹ = حضرت مولانا عبدالاحد دیوبندیؒ (۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء - ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء)

❁ **عملی زندگی**: (۱) ۳؍اگست ۱۹۶۸ء (۶؍جمادی الأخری ۱۳۸۸ھ) تا ۱۴؍جنوری ۱۹۸۷ء (۱۷؍جمادی الأخری ۱۴۰۷ھ) مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بہ حیثیت علمی رفیق، تالیفی وتصنیفی ذمے داریاں انجام دیں۔

(۲) اس کے بعد ۱۵؍جنوری ۱۹۸۷ء (۱۸؍جمادی الاخری ۱۴۰۷ھ) تا وفات ۱۹؍جنوری ۲۰۱۳ء (۶؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ) لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔

❁ **تالیفات**: ہندوستان میں عہد اسلامی میں عربی زبان وادب، تاریخ ندوۃ العلماء، جلد دوم، صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام۔

❁ **تراجم**: ترجمہ از عربی کتاب ''اِقْتِضَاءُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ'' تالیف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ بہ عنوان ''اسلامی وغیر اسلامی تہذیب''، ترجمہ از عربی کتاب ''رَوَائِعُ إِقْبَال'' تالیف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، بہ عنوان ''نقوشِ اقبال''، ایک مصری فاضل ''متولی یوسف چلپی'' کی

عربی تالیف کا اردو میں ''مسیحیت'' کے عنوان سے ترجمہ کیا، جوان اِضافوں اور تحقیقی تحریر کی وجہ سے جوانھوں نے اپنے قلم سے لکھی، ان کا اردو ترجمہ اصل عربی سے بھی خوب تر مانا گیا۔ اِسی کے ساتھ اُنھوں نے بہت سے علمی وادبی باوقار رسالوں کو اپنے رشحاتِ قلم سے زینت بخشی، جنھیں جمع کردیا جائے تو کئی کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔

❁ **وفات**: شنبہ:۶؍ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۹؍جنوری ۲۰۱۳ء کو بہ وقتِ ظہر لکھنؤ میں ہوئی۔ شنبہ- یک شنبہ:۶-۷؍ربیع الاول=۱۹-۲۰؍جنوری کی شب میں نماز جنازہ بعد نماز عشا اُن کے گھر کے قریب ''مدح گنج''، لکھنؤ میں ہوئی اور ''تکیہ تارن شاہ'' قبرستان واقع محلّہ ''کھدرا'' میں تدفین عمل میں آئی۔ بہ وقتِ وفات اُن کی عمر بہ حساب سنۂ عیسوی ۶۸ سال اور بہ حساب سنۂ ہجری ۷۰ سال تھی۔

❁ ❁ ❁